بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

موجودہ حکومت جمہوریت کے سارے بلند بانگ دعووں کے باوجود اس راہ پر گامزن ہے جسے کسی صورت بھی جمہوریت کی راہ نہیں کہا جا سکتا بلکہ صحیح طور پر فسطائیت کی راہ کہا جا سکتا ہے۔ حکومت کا مزاج اس کا طرزِ عمل، قومی مسائل کو طے کرنے کے طریقے، عوام کے جذبات میں اشتعال پیدا کرنے کے مختلف حربے یہ سب اس بات کی دہائی دے رہے ہیں کہ حکومت نخلِ جمہوریت کو بار آور ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتی بلکہ فسطائیت کو پروان چڑھانے کا عزم رکھتی ہے۔

اقتدار کے آمرانہ مزاج کی شہادت میں یوں تو کئی ایک مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن اس نے جو ظالمانہ سلوک ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ ہفت روزہ زندگی اور ہفت روزہ پنجاب پنچ کے مدیروں اور ناشروں سے کیا ہے اُسے دیکھتے ہوئے اس کی جمہوریت پسندی کا سارا پول کھل جاتا ہے۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ جس ناانصافی اور فسطائی ذہنیت کا مظاہرہ ان جرائد کے بارے میں کیا گیا ہے اس کی مثال تو انگریزی حکومت کے پورے دورِ استبداد میں بھی نہیں ملتی۔ غیر ملکی سامراج پریس سے ہمیشہ خوفزدہ رہا اور اس نے اس کی آواز کو غیر مؤثر بنانے بلکہ دبانے کے لیے بڑے عجیب و غریب ہتھکنڈے استعمال کیے مگر جس تعدی اور لاقانونیت سے ان پرچوں کا گلا گھونٹا گیا ہے اسے نرم سے نرم الفاظ میں بھی انسانیت سوز کہا جا سکتا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ انسانی حقوق کے واضح احساس اور شعور سے جمہوریت جنم لیتی ہے، تقریر و تحریر کی آزادی اور اجتماع کی آزادی سے یہ پروان چڑھتی ہے اختلاف رائے کو ٹھنڈے دل سے سننے اور خندہ پیشانی سے اُسے برداشت کرنے اور اس کے مقابلے میں دلیل کے ساتھ اپنا موقف بیان کرنے اور ناقد کو اس کی غلطی واضح کرنے سے اس میں ذہنی اور اخلاقی پختگی پیدا ہوتی ہے۔ کسی جمہوری معاشرے کی حکومت کبھی بھی اس بات کا پابند

نہیں کرتی کہ اگر کوئی زبان کھولے تو صرف سرکارِ عالی مدار کی تعریف و توصیف میں کھولے ورنہ بند رہے۔ بیان کی آزادی ایک انسان کا فطری حق ہے جسے جمہوری معاشرہ کبھی بھی سلب نہیں کرتا۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ اگر کوئی فرد یا گروہ آزادی رائے کی آڑ میں ملک کے اندر انتشار پھیلا رہا ہے تو اسے اس مذموم کام سے باز رکھنے کے لیے عدالت کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اُس کے لیے مارشل لا کا سہارا نہیں لیا جاتا ہمارے اس ملک میں اخبارات اور جرائد کو اپنی جائز حدود سے آشنا کرنے اور انہیں ان کا پابند بنانے کے لیے پریس لاز کی صورت میں قوانین موجود ہیں ان کے ہوتے ہوئے مارشل لا کے تحت کارروائی اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ حکومت کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہے کہ اس کا موقف اخلاقی اور قانونی اعتبار سے کمزور ہے اور اسی وجہ سے وہ مارشل لا کے ذریعے اپنے خیال میں ناخوشگوار آوازوں کو خاموش کرنا چاہتی ہے اگر اس کا اخلاقی موقف مضبوط ہوتا تو وہ نشر و اشاعت کے نہایت وسیع ذرائع جن کی وہ تنہا مالک ہے ، سے کام لیکر اُن ناقدین کی غلطیوں کو عوام کے سامنے لاتی اور انہیں یہ بتاتی کہ یہ لوگ کس طرح کی بودی باتیں کرتے ہیں اور اگر حکومت قانونی نقطۂ نظر سے اپنے موقف کو مضبوط پاتی تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتی اور ان حضرات سے انہیں سزا دلواتی جنہیں ملک میں عدل و انصاف کی حکمرانی قائم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اگر قاتل ہی شاہد اور منصف بن جائیں تو پھر انصاف کا خون ناگزیر ہے کیونکہ قاتل خود نہ تو اپنے خلاف شہادت دے سکتا ہے اور نہ اپنے آپ کو مجرم قرار دے کر سزا دینے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ موجودہ حکومت میں اگر کوئی فرد بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اقتدار کے نشہ نے اس کی فکری صلاحیتوں کو بالکل مفلوج نہیں کر دیا تو اُسے اپنے اس ظالمانہ طرزِ عمل کے دُور رس نتائج پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ کیا اِس قسم کے آمرانہ ہتھکنڈوں سے کسی آواز کو مستقل طور پر دبایا جا سکتا ہے اگر یہ بات کسی طرح ممکن ہوتی تو نمرود کی خدائی کو کبھی زوال نہ آتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جس رفتار سے اختلافات کی ناخوشگوار آوازوں کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے اُسی رفتار سے ان میں شدّت پیدا ہو جاتی ہے اور بالآخر ان آوازوں کی خوفناک چیخوں سے حکومت کے ایوان لرزنے لگتے ہیں اور جلد ہی پیوندِ خاک ہو جاتے ہیں۔ اس بنا پر حکومت کو یہ آمرانہ اندازِ فکر ترک کر کے معقول طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے کیونکہ اسی میں اُس کی بھلائی ہے۔ کاش ہمارے حکمران تاریخ سے سبق حاصل کریں اور ان خوشامدیوں کے مشوروں سے بچیں جنہوں نے ہر دور میں ذاتی مفادات کی خاطر اصحابِ اقتدار کو گمراہ کر کے انہیں عبرتناک انجام سے دوچار کیا۔

خدشات کی جس فضا میں قومی اسمبلی کا اجلاس بلایا گیا اور جس عجلت میں ایک عبوری آئین منظور کر کے اسے نافذ کیا گیا اسے دیکھتے ہوئے عام تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ضمن میں بھلائی کا جو کام بھی ہوا تھا وہ خوشدلی کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ سخت مجبوری کے ساتھ کرنا پڑا ہے۔ یہ بات بلاشبہ موجبِ اطمینان ہے کہ مارشل لا کی تاریک رات کا خاتمہ ہوا ہے مگر جس صبحِ آزادی کا مژدہ ہمیں سنایا گیا تھا وہ ابھی طلوع ہوتی نظر نہیں آتی بلکہ صبحِ کاذب کی چند دھندلی لکیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمیں یہ تسلی دی جا رہی ہے کہ یہی وہ صبح ہے جس کے تم اتنی دیر سے منتظر تھے۔ حکومت کے حاشیہ نشین اس آئین کی مدح و ستائش میں جو چاہیں کہتے رہیں مگر وہ آنکھ جو صبحِ صادق کی نشانیوں کو پہچاننے کی قدرت رکھتی ہے اسے کسی صورت بھی دھوکا نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اسے اچھی طرح علم ہوتا ہے کہ یہ صبحِ آزادی کی وہ سفیدی نہیں جو رات کے اندھیروں پر غالب آ کر پوری فضا میں نور کے لطیف ریزے بکھیر کر اسے بقعۂ نور بنا دیتی ہے۔ یہ صبحِ کاذب کی سفیدی ہے جس سے سطح بیں آنکھیں تو دھوکا کھا کر اسے طلوعِ صبح کی بشارت سمجھ سکتی ہیں مگر دیدۂ بینا سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اس صبحِ کاذب کے پسِ پردہ رات کو اپنے تاریک سائے پھیلانے کا موقع میسر آ رہا ہے۔ دستور کے بارے میں برسرِ اقتدار طبقے کے آمرانہ عزائم کو جاننے کے لیے کسی لمبی چوڑی قانونی مہارت کی ضرورت نہیں بلکہ ایک عام شہری کی حیثیت سے بھی اگر اس پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی جائے تو اس کے اسلامی اور جمہوری مزاج کی حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔ ہم یہاں اس کے چند نکات بطورِ مثال پیش کرتے ہیں

برسرِ اقتدار پارٹی جن نعروں کو لے کر اٹھی تھی اس میں دو نعرے یہ تھے کہ "اسلام ہمارا مذہب ہے" اور "جمہوریت ہماری سیاست ہے" مگر اس دستور کی تدوین میں ان نعروں کو جس انداز سے پسِ پشت ڈالا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ درحقیقت سادہ لوح عوام کو دھوکا دینے کے لیے محض نعرے ہی تھے، ان کے پیچھے کوئی خلوص اور عزمِ صادق کارفرما نہ تھا اس لیے انہیں ترتیبِ دستور کے مرحلے میں نظرانداز کر دیا گیا ہے۔

دستور میں قراردادِ مقاصد شامل کر کے یہ تاثر تو بلاشبہ دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس ملک میں حاکمیت صرف خداوند تعالیٰ کی ہے اور جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار کی باگیں ہیں وہ ایک محدود پیمانے پر اس حاکمیت کے امین ہیں اس لیے وہ مطلق العنان اصحابِ اقتدار نہیں بلکہ اس زمین میں خلق کے بارے میں خدا کے منشا کو پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ اسلام نے مسلمان حکمران اور اسلامی ریاست پر جو ذمہ داریاں ڈالی

ہیں وہ صرف اسی حد تک محدود نہیں کہ فلاں فلاں کام جو منشائے الٰہی کے خلاف ہیں ان سے باز رہنے اور عوام کو باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ ان ذمہ داریوں کا دائرہ ان سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اسلام منکرات سے بچنے کے ساتھ ساتھ مسلمان حکمرانوں اور مسلم معاشرے کو اس بات کا پابند بھی کرتا ہے کہ وہ "معروف" کو پوری قوت کے ساتھ نافذ کرے۔ قرآن کریم میں اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط (الحج: ۴۰)

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے۔

آپ پورے دستور کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ "معروف کے بارے میں ایک اسلامی ریاست پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں انہیں کس حد تک تسلیم کیا گیا ہے اور ان ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے کس عزم کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو یہ دستور بڑا مایوس کن ہے۔ اس میں نہ تو نظامِ صلوٰۃ کے قیام کا کوئی تذکرہ ہے اور نہ نظامِ زکوٰۃ کے نفاذ کا کوئی منصوبہ اور نہ معروف کو ملک میں پھیلانے کی کوئی ضمانت۔ اسلام کے تقاضے قراردادِ مقاصد کی اس شق کہ اسلام نے جمہوریت، آزادی، مساوات اور رواداری کے جو تصورات پیش کیے ہیں انہیں بروئے کار لانے کی کوشش کی جائیگی سے تو پورے نہیں ہوتے۔ ان تصورات کو تو دوسری قومیں بھی کسی نہ کسی صورت میں اپنا رہی ہیں اسلامی ریاست صرف ان تصورات کی وجہ سے دوسری ریاستوں سے ممتاز نہیں بلکہ اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی حدود میں بسنے والوں کو ان اوصاف سے متصف کرنے کی کوشش کرتی ہے جن کی بنا پر وہ دنیا اور آخرت میں خداوند تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرسکیں۔

جہاں تک اسلامی معاشرے سے منکرات کے استیصال کا تعلق ہے اس کا تذکرہ بھی دستور میں بڑے نیم دلانہ انداز سے کیا گیا ہے اور ان برائیوں کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لیے اسلام جس سختی سے تاکید کرتا ہے اس کا کوئی ادنیٰ اشارہ بھی ہمیں دستور میں نہیں ملتا۔ شراب، جوئے، قحبہ گری اور اسی نوعیت کی دیگر برائیوں نے ہمیں جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے اُس سے اس ملک کا بچہ بچہ واقف ہے۔ معدودے چند

افراد کو چھوڑ کر ملک کی پوری آبادی ان کا قلع قمع چاہتی ہے اور حکومت سے بار بار اس بات کا مطالبہ کر رہی ہے کہ وہ کسی طرح مسلم معاشرے کو ان برائیوں سے پاک کرے۔ اگر حکومت کے دل میں اپنی اسلامی ذمہ داریوں کا کچھ بھی احساس ہوتا اور اسے عوامی جذبات کی کچھ بھی قدر ہوتی تو وہ دستور میں بڑے واضح الفاظ میں ان کے استیصال کا ذکر کرتی لیکن دستور میں جس انداز سے ان برائیوں کی "حوصلہ شکنی" پر اکتفا کیا گیا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ حکومت بڑے جبر و اکراہ کے ساتھ ان برائیوں کے بارے میں "حوصلہ شکنی" کا رویہ اختیار کر رہی ہے۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر انہیں یکسر ممنوع قرار دینے میں کونسی چیز مانع ہے۔

جوئے اور قحبہ گری کی تباہ کاریوں کے متعلق تو ان افراد اور ان قوموں کو بھی کوئی اختلاف نہیں جو ان برائیوں میں ملوث ہیں۔ باقی رہی شراب تو اس کے بارے میں بھی اطباء اور ماہرین نفسیات کی یہ رائے ہے کہ اس کے استعمال سے نہ صرف صحت برباد ہوتی ہے بلکہ معاشرے میں خوفناک قسم کے نفسیاتی عوارض بھی جنم لیتے ہیں جن سے افراد اور معاشرے سب کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔ ہمارے اس ملک میں اب جبکہ شراب کی مخالفت کا موضوع زیر بحث ہے تو بعض چوٹی کے ڈاکٹروں نے بڑے واضح دلائل کے ساتھ اس ام الخبائث کے نقصانات کا تذکرہ کیا ہے اور اس باطل خیال کی تردید کی ہے کہ یہ صحت کے لیے کسی اعتبار سے بھی مفید ہو سکتی ہے۔

غیر مسلموں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی تعلیمات کے بارے میں جو متعدد کتب اور مضامین لکھے ہیں ان میں اس امر کا برملا اعتراف کیا گیا ہے کہ حضور نے انسانی معاشرے میں ان برائیوں کو مٹانے کے معاملے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے عرب جیسی شراب کی رسیا قوم میں اس لعنت کا یکسر خاتمہ اسلام کے معجزات میں سے ایک زندہ معجزہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں یوں تو بہت سی تحریریں پیش کی جا سکتی ہیں مگر ہم یہاں اسلام کے چند جانے پہچانے دشمنوں کی آراء نقل کرتے ہیں۔

سر ولیم میور کی اسلام دشمنی آخر کس سے پوشیدہ ہے؟ وہ اپنی کتاب "لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وسلم" میں لکھتا ہے:

> "اسلام انتزاع شراب کے معاملے میں جس قدر بھی فخر کرے وہ حق بجانب ہے کیونکہ کوئی دوسرا مذہب اس میدان میں اس کا سہیم نہیں ہو سکتا۔" (ص ۵۲۱)

مشہور پادری ٹیلر نے چند برس بیشتر اپنی ایک مذہبی تقریب میں اسلام کی اس عظمت کا کھلے بندوں اس طرح اعتراف کیا:

"علاوہ اور باتوں کے اسلام پوری دنیا میں امتناعِ شراب کی ایک عالمگیر تحریک ہے۔ اس کے مقابلے میں یورپین تجارت کے فروغ پانے سے شراب نوشی، اخلاقی عیوب اور انسانیت کی تذلیل کا سامان فراہم ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر مارگولیتھ جیسا عدوِ اسلام اخلاقی میدان میں دینِ حق کی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے جب قماربازی کا تذکرہ کرتا ہے تو وہ یہ تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ حضور سرورِ دوعالم نے اس برائی سے معاشرے کو جس طرح پاک کیا وہ حضورؐ کی اصلاحات میں سب سے نمایاں اصلاح کہلانے کی مستحق ہے۔"

یہ بات ہمارے لیے کس قدر باعثِ شرم ہے کہ جن اخلاقی عیوب کے خاتمہ کی وجہ سے پوری انسانیت ہماری ممنونِ احسان ہو اور ہمارے جن امتیازی اوصاف کے ہمارے کٹر سے کٹر دشمن بھی معترف ہوں ان کے بارے میں ہم تذبذب کی پالیسی اختیار کریں اور پوری قوت سے نہ تو ان برائیوں کو مٹانے کا عزم کریں اور نہ ان اوصاف سے متصف ہونے کے لیے جدوجہد کا کوئی لائحہ عمل تیار کریں۔ بات اگرچہ بڑی سخت ہے لیکن فی الحقیقت ہمارے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ بھارت اور نام نہاد بنگلہ دیش جن کے دساتیر کی اساس لادینیت پر رکھی گئی ہے ان کے اندر تو شراب پر پابندی عائد کی جائے اور ہمارے اسلامی ملک کے عبوری مسودے میں صرف "حوصلہ شکنی" کے الفاظ درج کر کے عوام کا منہ چڑایا جائے۔

پھر ان برائیوں کی "حوصلہ شکنی" کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ حوصلہ شکنی کے اس دائرے کو نچلے طبقوں اور جھونپڑوں کے اندر رہنے والوں تک محدود رکھا گیا ہے۔ باقی رہے وہ لوگ جو "تہذیب و تمدن" کے جدید ساز و سامان کے ساتھ ان برائیوں کے ارتکاب کے ڈھنگ جانتے ہیں وہ "حوصلہ شکنی" کی زد سے یکسر باہر ہیں مثلاً جوئے کی تو "حوصلہ شکنی" کی جائے گی لیکن اگر جوا "ریس" کی صورت میں کھیلا جائے تو اسے دستور کے اندر حوصلہ شکنی کی دستبرد سے پورا تحفظ حاصل ہو گا۔

دینی نقطہ نظر سے اس عبوری آئین کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس میں مسلمان کی تعریف پیش نہیں کی گئی درآنحالیکہ ایک نظریاتی مملکت کے دستور کی حیثیت سے اس میں اس تعریف کا اندراج انتہائی ضروری تھا۔ جس "خانہ ساز نبوت" کے وابستگان کی ناراضگی کے پیشِ نظر اس اہم معاملے کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے اُسے سب لوگ جانتے ہیں۔ معقولیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ پورے ایوان کے سامنے اس بات کو تسلیم کر لیا جاتا

کہ اصحابِ اقتدار کسی صورت میں ربوہ کی خلافت کو ناراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ مگر اس معقول طرزِ عمل کو اختیار کرنے کے بجائے منیر رپورٹ کی آڑ لے کر یہ کہا گیا کہ چونکہ علماءِ کرام مسلمان کی کوئی ایک تعریف متعین کرنے پر متفق نہیں ہو سکے اس لیے ہم بھی دستور میں کوئی تعریف درج کرنے سے قاصر ہیں۔ جسٹس منیر صاحب کا یہ اعتراض کہاں تک صحیح ہے اور انہوں نے یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے اعتراضات جن مقاصد کے پیشِ نظر اٹھائے تھے وہ اب کوئی ڈھکی چھپی باتیں نہیں رہیں۔ پھر علماء نے ان سارے اعتراضات کے جس طرح مسکت جوابات دیئے وہ بھی سب کے سامنے ہیں۔ ان سارے حقائق کو جانتے ہوئے منیر رپورٹ کا سہارا لے کر اس اہم معاملے سے اغماض برتنا تجاہلِ عارفانہ نہیں بلکہ مجرمانہ تغافل ہے۔

جہاں تک اس دستور کے جمہوری مزاج کا تعلق ہے اُسے بھی کسی اعتبار سے پسندیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ جو لوگ اس ملک کی دستوری جدوجہد سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء سے قوم یک زبان ہو کر مطالبہ کرتی رہی ہے کہ ملک میں پارلیمانی نظام رائج ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس نظام کے تحت ہی ملک کے مختلف حصوں میں عدل و انصاف قائم ہو سکتا ہے۔ اسی بنیاد پر ۱۹۷۰ء کے انتخابات ہوئے۔ خود پیپلز پارٹی نے عوام سے اس نظام کے نفاذ کا وعدہ کیا اور اس کے صدر اور دوسرے زعماء اپنے اس وعدے کو بار بار دُہراتے رہے۔ لیکن اب جبکہ ایوان میں اس وعدے کے ایفاء کا وقت آیا تو حکمران پارٹی نے بڑا افسوسناک طرزِ عمل اختیار کیا۔ یعنی صوبوں میں تو پارلیمانی نظامِ حکومت کو تسلیم کیا گیا ہے مگر مرکز میں صدارتی نظام کے حق میں رائے دی گئی ہے۔ مرکزی وزیرِ قانون خود اس ملک کے ایک نامور ماہر قانون ہیں ان کے لیے یہ بات سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ نظامِ حکومت کی یہ دورنگی ملک میں کس قسم کی آئینی اور انتظامی پیچیدگیاں پیدا کرے گی، خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ صدر کو غیر محدود اختیارات بھی حاصل ہونگے اور اس کے انتخاب میں عوام کا براہِ راست عمل دخل بھی نہ ہوگا۔ بلکہ صرف قومی اسمبلی کے ارکان انہیں منتخب کرنے کے مجاز ہوں گے۔ یہ سب تدابیر اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ صدارت کے پردے میں ملک کے اندر آمریت قائم کی جا رہی ہے۔

کسی ملک میں جمہوریت کے قیام کی پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ عوام براہِ راست اپنے حکمرانوں کا انتخاب

(باقی صفحہ ۴ پر)

بقیہ اشارات

کریں اور انتخاب کے بعد جب اختیارات کی باگیں انہیں سونپی جائیں تو ان سے پریس کے ذریعے یا اپنے نمائندوں کے ذریعے باز پُرس کی جا سکے۔ لیکن اگر اس راہ کو چھوڑ کر کوئی دوسری راہ اختیار کی جائے تو پھر ملک میں جمہوریت کو فروغ حاصل نہیں ہوتا بلکہ آمریت کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ آخر سمجھیے کہ سابق صدر ایوب خاں کی بنیادی جمہوریتوں کا نظام جمہوریت کے لیبل کے باوجود کیونکر عالمِ واقعات میں آمریت پر منتج ہوا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ صدر کے انتخاب میں عوام براہِ راست دخیل نہ تھے بلکہ ایک محدود حلقہ جسے انتخابی ادارے کا نام دیا جاتا تھا وہ اس فرض کو انجام دیتا تھا۔ اس ادارے کے چند سو ارکان کو اپنی مرضی کے مطابق چلا لینا بڑے وسیع اختیارات رکھنے والے صدر کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ چنانچہ عملاً یہی ہوا کہ فیلڈ مارشل ایوب خاں صاحب پہلے تو حقیقی اکثریت سے چاہتے صدر منتخب ہوتے اور اس کے بعد وہ اپنے نامزد وزراء اور مشیروں سے جس طرح چاہتے کام لیتے۔ وہ سب ان کے سامنے جوابدہ تھے مگر صدر صاحب ان کے سامنے جوابدہ نہ تھے۔

موجودہ دستور میں صدر کو منتخب کرنے کے لیے جس انتخابی ادارہ یعنی قومی اسمبلی کو ذمہ دار ٹھیرایا گیا ہے اس کے ارکان کی تعداد تو بنیادی جمہوریت کے ارکان کی تعداد سے بھی کم ہے۔ اس لیے جو لوگ صدر کے انتخاب کے اس طریقے میں آمریت کے خدشات کا اظہار کرتے ہیں ان کے خدشات کو بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا۔ پھر ان خدشات کو اس بات سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ دستور میں صدر کو وزراء کے مشورے پر عمل کرنے کا پابند نہیں ٹھیرایا گیا بلکہ وزراء کو صدر صاحب کی مرضی کا پابند بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ صدر کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ اس دستور میں ہر قسم کا ردّوبدل اور ترمیم و اضافہ کر سکے اور اسمبلی کو جب چاہے توڑ دے۔ کوئی صدر اس قسم کے وسیع اختیارات حاصل ہونے کے باوجود اگر آمر بننے سے اجتناب کرتا ہے تو یا تو وہ مافوق الفطرت انسان ہے یا پرلے درجے کا احمق ہے۔ جہاں تک موجودہ صدر صاحب کا تعلق ہے ہم ان میں ان دونوں صفات میں سے کوئی صفت بھی نہیں پاتے۔